تنقیدی جائزے

از

سیّد احتشام حسین

اِدارۂ اشاعتِ اُردو
حیدرآباد (دکن)

پہلا ایڈیشن ــــــــــ ایک ہزار

پروپرائٹر

سید عبدالرزاق تاجر کتب

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس

حیدرآباد

(دکن)

فہرست مضامین

	انتساب	۵
	عرض ناشر	۷
	دیباچہ	۹
(۱)	اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت	۱۳
(۲)	نئی شاعری کے نقّاد	۴۴
(۳)	ادب اور اخلاق	۵۷
(۴)	نئے ادبی رجحانات	۸۳

(۵) قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد ۱۰۷

(۶) چکبست، بہ حیثیت پیامبر دورِ جدید ۱۲۷

(۷) فانی بدایونی ۱۴۷

(۸) نظیر اکبرآبادی اور عوام ۱۶۵

(۹) سحرالبیان پر ایک نظر ۱۹۳

(۱۰) مواد اور ہیئت ۲۱۶

(۱۱) سوانح نگاری ۲۶۶

(۱۲) تحفظِ زبان کا مسئلہ ۲۸۷

نظیر اکبر آبادی اور عوام

عصرِ حاضر کی تنقید نگاری میں تاریخی تصور کو بنیادی جگہ مل جانے کی وجہ سے ہم جس شاعر یا ادیب کے متعلق کچھ سوچنا یا لکھنا چاہتے ہیں اُسے اُردو ادب کی تاریخ کے مفروضہ ادوار میں سے کسی نہ کسی دور میں جگہ دیکر اُسی دور کی خصوصیات و رجحانات کی روشنی میں اُس کا کلام دیکھتے ہیں۔ تاریخ کو ادوار میں تقسیم کرنے سے کبھی کبھی آسانیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن اکثر اس کی وجہ سے ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہونچتے کیونکہ انسانی فطرت کی سطح صرف خارجی اسباب سے نہیں بنتی (اگرچہ خارجی اسباب ہی اصل چیز ہیں اور وہی داخلی اور اندرونی کیفیات کو بھی ترتیب دیتے ہیں) بلکہ کچھ انفرادی اور ذاتی خصوصیتیں ہوتی ہیں جو اس دور کی عام خصوصیات سے علیٰحدہ ہوتی ہیں، اس کے علاوہ مختلف الخیال شعراء ماحول کی ترجمانی اپنے نقطۂ نظر سے کر کے نئی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں۔ اُردو شاعری کی تاریخ کے پس منظر میں دہلی اور لکھنؤ کی سیاسی و اقتصادی تاریخ اور وہاں کی وہ معاشرتی حالت ہے جس کو سمجھے

بغیر اُردو شاعری کا سمجھنا دشوار ہے۔

شمالی ہند میں اُردو زبان کچھ دنوں تک عوام کی چیز رہنے کے بعد دہلی دربار سے وابستہ ہوگئی اور اُردوئے معلّیٰ کا نام پاکر ایک معیاری زبان بن گئی۔ تھوڑے دنوں میں لکھنؤ نے بھی اس انحطاط پذیر تمدن کی حفاظت کے سلسلہ میں اُردو کی خدمت شروع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو زبان اور ادب کا تعلق دہلی اور لکھنؤ سے اس طرح ہوگیا کہ اُسکی ترقی و تنزل انھیں دو جگہوں کی ترقی و تنزل سے وابستہ نظر آنے لگی۔ جو شعراء دوسری جگہ پیدا ہوئے یا بڑھے ان کا تعلق بھی اکثر و بیشتر کسی نہ کسی طرح دہلی اور لکھنؤ ہی سے ہوگیا اور شاعری کا معیار انھیں مرکزوں کی وابستگی کے خیال پر جانچا جانے لگا یہاں تک کہ باہر رہنے والوں کے لئے شہرت اور ترقی کی گنجائش ہی نہ رہی ایسی حالت میں جن لوگوں کا تعلق شاہی درباروں سے ہوگیا اُن کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں لیکن جو لوگ براہِ راست دربار کے زیرِ سایہ نہ تھے وہ بھی اسی معیاری زبان، معیاری ادب، معیاری تہذیب و تمدن کی ترقی کو اصل چیز سمجھنے لگے، یہی وجہ ہے کہ ہم اُن شعراء کے کلام میں جن کی پرورش دربار سے ہوتی تھی یا جن کا مفاد کسی طرح دربار کے مفاد سے وابستہ تھا نیز دوسرے شعراء میں زیادہ فرق نہیں پاتے دونوں کے یہاں ہمیں جو کمی نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ فن شاعری کے لحاظ

سے تو وہ تکمیل کا نقشہ پیش کر دیتے ہیں لیکن تخیل کے لحاظ سے اُن چشموں سے سیراب نہیں ہوتے جن سے شاعری کے موضوعات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ دربار سے وابستہ رہنے والے، تصوف سے دلچسپی لینے والے اور مرکز سے متاثر ہونے والے شاعروں سے ہمارا سابقہ پڑتا ہے اور یہ سب اپنی خصوصیات اور اپنے تعلقات کی وجہ سے عوام سے علیحدہ رہتے ہیں۔

مرکزیت، معیار کی پابندی اور دربار سے وابستگی کی وجہ سے اُردو شاعری کا میدان بہت تنگ ہو گیا، جو شاعر ان قیود سے کسی طرح بچ سکے وہ البتہ عوام سے اور عوام کے مسائل سے قریب تر آئے لیکن ایسے شعراء کا نام مثال کے طور پر لکھنے کے لئے بھی نہیں ملتا۔ اُردو شاعری کے دورِ متقدمین اور متوسطین میں لے دے کر نظیر اکبر آبادی کا نام سامنے آتا ہے۔ ان کا تعلق براہِ راست نہ دلّی سے تھا اور نہ لکھنؤ سے۔ اُردو ادب کی تاریخ میں نظیر کا اپنا ایک الگ دور ہے) وہ کسی دور میں کسی گروہ کے ساتھ شریک نہیں کئے جا سکتے۔ نظیر کی عمر اکبر آباد میں بسر ہوئی اگر نکلے تو گرد و پیش کے اضلاع متھرا اور بندرابن وغیرہ تک چلے گئے۔ وہ دلّی اور لکھنؤ دونوں سے الگ اپنی ایک علیحدہ دنیا بنا رہے تھے۔ اس لئے نہ تو ہم اُن کے یہاں وہ معیارِ شاعری پاتے

ہیں جو دلّی اور لکھنؤ میں پایا جاتا ہے، نہ زبان کی وہ صفائی نظر آتی ہے جو ان دو مرکزوں کے لئے مخصوص تھی اور نہ کسی دربار سے اُن کا تعلق ہی معلوم ہوتا ہے۔ اُستادی اور شاگردی کا رشتہ بھی بڑا اثر ڈالتا ہے لیکن ہمیں کہیں سے پتہ نہیں چلتا کہ دلّی یا لکھنؤ کا کوئی شاعر اُن کا اُستاد رہا ہو۔ یہ باتیں نظیر کو دوسرے شعراء سے بہت الگ کرتی ہیں۔

نظیر نے دربار سے علیحدہ رہکر عوام سے رشتہ جوڑا۔ اُن سے پہلے یا اُن کے بعد اُردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس سے ہم اُن کا مقابلہ کریں یا اُس کے دور میں اُنھیں رکھیں اِسی لئے میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ نظیر کا اپنا ایک علیحدہ دور تھا جو زمانی حیثیت سے اُردو شاعری کے کئی ادوار پر حاوی تھا۔ نظیر کی صحیح تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کا انتقال ۱۸۳۰ء میں ہوا۔ عمر کے متعلق تذکرہ نویسوں اور تاریخ ادب لکھنے والوں کا خیال ہے کہ اسّی پچاسی سال سے کم نہیں جئے اس لئے اگر ہم اُن کی تاریخ پیدائش ۱۷۴۰ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان مان لیں تو ہمارا کام چل جاتا ہے۔ اُردو شاعری کے دور متقدمین کے ابتدائی شعراء کو چھوڑ دیجئے تو بھی عمر کے لحاظ سے نظیر کے ہم عصر کم سے کم بیس مشہور شعراء قرار پاتے ہیں دوسرے درجے کے بعض صاحبان کمال اور تیسرے درجے کے شعراء کا ذکر نہیں۔ شعراء کی جس بڑی تعداد کو مورخین نے کئی ادوار میں

تقسیم کیا ہے وہ سب نظیر کے ہمعصر ہیں۔ اس کی پوری اہمیت شاید ناموں سے واضح ہو سکے۔ صرف اُن کے نام سنئے جنھوں نے اُردو شاعری کے ارتقاء میں حصّہ لیا ہے۔ حاتم، فغاں، میر، سودا، درد، سوز، مظہر تاباں، قایم، یقین، حسن، رنگین، نصیر، جرأت، انشاء، مصحفی، رند، ناسخ، آتش (سلسلہ کا خیال نہیں کیا گیا ہے) ان میں سے کون نام ایسا ہے جسے اُردو ادب کی خدمت کے سلسلہ میں کسی نیچے درجہ پر رکھا جا سکتا ہے اور پھر ان میں سے کون ہے جسکی دنیا کی سرحد نظیر کی دنیا سے ملتی ہے؟

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ نظیر اصل میں نظم لکھنے والے تھے غزل گو شعراء سے اُن کا مقابلہ درست نہیں۔ اس سلسلہ میں شاید یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ انھیں میں سے بعض شاعر نظم کے بھی اچھے اُستاد تھے۔ میر سودا، حسن، انشاء اور مصحفی نے نظمیں بھی لکھیں لیکن نظیر کے مقابلہ میں یہ لوگ کسی اور دنیا کے بسنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ وجہ بالکل ظاہر ہے ان میں سے ہر ایک کا تعلق کسی نہ کسی طرح دربار سے یا دربار کے ماحول سے تھا، اس لئے وہ عوام کے قریب نہ آسکے، اُن کی مثنویاں اور دوسری چیزیں زیادہ تر امارت اور اُس کے متعلقات یا انفرادی رنج و غم، ہجو یا مدح کا تذکرہ کرتی ہیں لیکن نظیر کا کلام پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود عوام میں سے تھے، انھیں میں سے اُٹھے اور انھیں کے دکھ

درد، ہنسی خوشی، افکار و تاثرات میں شریک رہے۔ اُن کا فن تکمیل کے لحاظ سے بہت ناقص ہے، اُن کی شاعری تراش خراش کے لحاظ سے بہت نامکمل ہے، اُن کے اسلوب میں بیحد ناہمواری ہے، اُنکے تفکّر میں گہرائی کا نام نہیں، اُن کے احساسات اور تجربات میں ایک دہقان کی بھونڈی سادگی اور بھدّی بے ساختگی ہے لیکن پھر بھی نظیر اپنی دُنیا کے تنہا مسافر تھے جس نے رابنسن کروسو کی طرح سب کچھ خود ہی کیا اور شاعری کے صحیح مصرف کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ انھوں نے احساسات اور جذبات کے لحاظ سے تقریباً ہر طبقہ کے لوگوں کے تجربات اور تاثرات پیش کئے لیکن اُن کی ہمدردیاں عوام ہی کیساتھ تھیں۔

عوام کے لفظ سے ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ضمناً اسے بھی واضح ہو جانا چاہیئے۔ بیسویں صدی میں عوام کے لفظ نے مفہوم کے اعتبار سے جو وسعت اختیار کر لی ہے اور سیاسی اصطلاح میں جن بیدار اور سیاسی شعور رکھنے والوں کی طرف اس لفظ سے اشارہ ہوتا ہے وہ نظیر یا اس وقت کے کسی شاعر اور ادیب کے ذہن میں نہیں ہو سکتا تھا۔ نظیر کے یہاں عوام سے مراد تمام عام لوگ ہیں چاہے وہ پیشہ ور ہوں یا کوئی اور۔ بہرحال نظیر کی شاعری کا اصل موضوع عام لوگوں کے محسوسات اور تجربات ہیں۔ ایسا کیوں ہے مادّی طور پر اس کے

کیا وجوہ ہیں ہم نے کسی حد تک اوپر کی سطروں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ موضوعات کی دنیا نہایت وسیع ہے لیکن نظیر کے یہاں اس وسعت کے باوجود خیال میں ایک طرح کی مرکزیت ہے جو ہر طرف پھیلنے اور بڑھنے کے باوجود کسی خاص جگہ تک پہونچنے کی کوشش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ خاص جگہ "موضوع سے عوام کا تعلق" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلے کوئی چیز عوام کے نقطہ نظر سے سوچی ہی نہ جاتی تھی مگر نظیر اپنے ماحول کی وجہ سے ہوتی برسات، عید، شب برات، دیوالی، اندھیری رات اور دوسرے مواقع پر اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ نظیر کا انداز بیان اور نظیر کے موضوعات شاعری برابر بدلتے رہے لیکن ہر حالت میں ایک صداقت اُن کی شاعری کے لفظ لفظ سے نمایاں ہوتی رہی۔ اُن کا انسانی ہمدردی کا مسلک کبھی نہیں بدلا۔ انہوں نے زندگی سے کبھی اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ اُنھوں نے عوام کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ہر حال میں اُن کی نظر اتنی وسیع رہی کہ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، امیر، غریب، فقیر اور پیشہ ور سب سما سکتے ہیں۔ عوام کی زندگی ویسے تو دکھ درد کا مخزن ہوتی ہے لیکن اپنی بنیاد میں بڑی طاقت رکھتی ہے، اُن کی اُمنگوں کے چشمے کبھی نہیں سوکھتے، سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں، خاندان بدلتے ہیں لیکن عوام اپنی راہ چلتے رہتے ہیں، وہ مایوسی

کا شکار نہیں ہوتے، نظیر نے انھیں کی اُمید سے اپنی شاعری کا چراغ روشن کیا ہے یہی وجہ ہے کہ نظیر کی شاعری میں ایک طرح کے بھدّے پن کے باوجود وہ شاعرانہ سادگی اور بیان میں وہ معصومانہ زور ہے جو معیاری شاعری سے الگ ہو کر تازہ زندگی پیدا کرتا ہے۔

کلیاتِ نظیر میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی لیکن یہاں موقعہ نہیں ہے کہ اُن کی غزلوں کا ذکر کیا جائے لیکن ایک مختصر سا جایزہ شاید اُن کی نظموں کے سمجھنے میں زیادہ مدد دے سکے۔ تغزل کے لئے جس اعتدال اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہے، جذبات میں جس نرمی اور گھلاوٹ کی احتیاج ہے، انداز بیان میں جس رکھ رکھاؤ سے کام لیا جاتا ہے وہ نظیر کو نصیب نہ ہو سکا، اُن کے یہاں خارجیت کا غلبہ غزلوں میں بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خارجیت ہی اُنھیں زندہ رکھنے والی چیز ہے وہ اسی خارجیت میں جذبات کی ہلکی ہلکی آنچ دیکر کیف پیدا کرتے تھے کبھی کبھی جذبات کی تیزی خارجی بیان کے جامہ میں بھی نہ سماتی تھی اور وہ کھل کر ایسی باتیں کہنے لگتے تھے جن کو جرأت کی معاملہ بندی کے پہلو میں بھی جگہ نہیں دے سکتے۔ بات یہ ہے کہ جذبات جب تک داخلیت کے قابو میں آکر نوک پلک سے درست نہ ہو جائیں غزل کی چیز نہیں بنتے اور خارجیت جذبات نگاری میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے

جو نظیر کے یہاں بہت ہے۔ غزلوں کا بیان اس سلسلہ میں یوں بھی ضروری ہے کہ نظیر نے اپنی بہت سی نظموں میں وہی عاشقانہ انداز بیان اور موضوع اختیار کیا ہے جو اُن کی غزلوں میں ہے۔ غزلیں بہت زیادہ شخصی اور ذاتی ہونے کی وجہ سے یقیناً نظموں سے الگ ہیں لیکن اثر وہی پیدا کرتی ہیں۔ غزل[1] کے چند شعر دیکھئے اور اُن کا مقابلہ اُن کی نظموں سے کیجئے جن میں کیفیات عشق، ہجر یا وصل کا بیان ہے (مثلاً آندھی، اندھیری رات، ہولی، چاندنی رات وغیرہ) غزل کے شعر یہ ہیں۔

دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی
اِک پٹ کُشتی کی ہم سے بھی تو کر دیکھو ذرا
ہاں بھلا ہم بھی تو دیکھیں پہلوانی آپ کی
دیکھو کہنا مانو مت خالی سلائی سے رکھو
ورنہ کوسے گی ہمیں یہ سُرمہ دانی آپ کی

---

[1] نظیر کی غزلوں پر یہ چند سطریں لکھتے ہوئے میں یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہتا کہ نظیر اچھے غزل گو نہ تھے بلکہ اسکا مقصد صرف یہ ہے کہ اُن کی نظم گوئی نے اُن کی غزل گوئی کو بہت دبا لیا ورنہ اُن کے یہاں سے غزلوں کے اشعار کا بھی ایک اچھا انتخاب ہو سکتا ہے جس میں صرف رسمی

(بقیہ صفحہ ۱۷۴ پر ملاحظہ ہو)

مجھے تو اُس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے
کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی

سچ تو یہ ہے کہ نظیرؔ کے یہاں جذبات کی شاعری کا موضوع بنانے کے فن کی تکمیل نہ ہو سکی، وہ عشق کی کیفیتوں کا بیان کم کر سکتے تھے لیکن عشق اور حسن کا بیان کم نہیں ہوتا۔ ایک طرح کی کھُلی کھُلی سادگی اور بے تکلفی ہے جو بعض جگہوں پر تو یقیناً ایک کیفیت پیدا کرتی ہے لیکن ہر جگہ نہیں۔ جذبات میں گہرائی کی کمی نے اُن کی اکثر نظموں کو بے کیف بنا دیا ہے اور جب انھوں نے زیادہ سوچا ہے اور داخلیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو سیدھے سادے اخلاق اور تصوف کے مسائل تک پہونچ سکے ہیں۔ جہاں فکری اور فلسفیانہ شاعری کا سوال اُٹھتا ہے وہاں نظیرؔ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ وہ انسانی جذبات کے معمولی تاثرات اور تجربات کا ذکر کرتے ہیں، روزانہ کی باتیں دُہراتے ہیں اور کبھی کبھی تصوف اور اخلاق کے مسایل کے سلجھانے کے لئے اشارات اور علامات کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن جہاں نظموں میں اپنے مادّی تجربات کا بیان ہے وہاں اُردو کے بہت کم شاعر اُن کے قریب پہونچتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۷۳)
شاعری کے نمونے نہیں بلکہ ذاتی کوائف کے نمونے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اپنے موضوع سے قریب تر آتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تو عوام ہی نے نظیر کو زندہ رکھا۔ اُردو شاعری کی معیار پرستی نے نظیر کو ختم ہی کر دیا تھا اگر فقیروں اور گداگروں نے اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں نے اُن کے بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور دوسری نظموں کو یاد نہ رکھا ہوتا۔ اُن کے موضوعات کی فہرست ہی پر ایک نظر اس بات کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ نظیر انسان اور انسانی متعلقات میں سے اُن معمولی چیزوں کو نظر انداز نہ کرتے تھے جنھیں بڑے بڑے شعراء نہ دیکھتے تھے اور نہ محسوس کرتے تھے، یا اگر محسوس بھی کرتے تھے تو اس پر لکھنا شاعری کے جوہر کو غلط استعمال کرنے کے برابر جانتے تھے۔ آٹا، دال، پیسہ، کوڑی، جھونپڑا، تلاش زر، ہولی، مفلسی، روٹیوں کی تعریف بنجارہ نامہ، آدمی نامہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں اُن کا پسندیدہ موضوع تھیں کیونکہ نظیر غریبوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، متھرا اور بندرابن کے تیرتھوں میں جاتے تھے، مسلمانوں کے عرس اور ہندوؤں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے عید اور شب برات کے ساتھ ساتھ ہولی اور دیوالی سے بھی ایک سچے ہندوستانی کی طرح لطف اُٹھاتے تھے اگر اُنھوں نے مسلمانوں کے خیال سے رسول اسلام، حضرت علیؑ، معجزہ حضرت عباسؑ اور سلیم چشتی پر لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو ہندوؤں کے

خیال سے اپنی شاعری کا زیادہ حصہ بھگتی شاعروں کی طرح سری کرشن جی کے لئے وقف کر دیا۔ ہولی کی خوشی کا جو بہترین مادّی مصرف ہو سکتا تھا اُس کا ذکر نہ صرف امراء کے نقطۂ نظر سے کیا بلکہ عوام کو بھی یاد رکھا۔ وہ انھیں کسی حالت میں بھی نہ بھولتے تھے اور سماج کی اس تضادی کیفیت کا ذکر ضرور کرتے تھے جس سے طبقات کا فرق پوری طرح نمایاں ہوتا ہے پہلے اور کسی قدر آج بھی فن کاروں کے یہاں تقابل کا آسان طریقہ اثر بڑھانے کے لئے برابر استعمال ہوتا رہا ہے۔ نظیر نے اُسے اپنے شاعرانہ انداز بیان کا سانچہ بنا لیا ہے اکثر و بیشتر نظموں میں چاہے عشق و عاشقی کا کا بیان ہو یا وصل و ہجر کا، موت کا بیان ہو یا مفلسی کا، برسات کا ذکر ہو یا عید کا، امیر اور غریب کو ساتھ ساتھ لائے ہیں۔ مثال کے طور پر "برسات کی بہاریں[1]" دیکھئے:۔

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا
یا سائبان ستھرا یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا

---

[1] میرے سامنے کلیاتِ نظیر مطبوعہ نولکشور پریس ہے بعض الفاظ اور قوافی کی صحت مجھے کھٹکتی ہے لیکن دوسرے نسخے مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔

مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گذارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لوئی
وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھرے ہیں لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی
ہے ان کے سر پہ سر کی یا بورئے کی کھوئی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا، کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں اور پائنچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیّا پکّا پکایا کھانا
ان کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اٹھانا
ہے جن کو اپنے گھر کا یا نون تیل لانا
ہے سر پہ اُن کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جگہ اسی طرح کا تقابل اثر میں اضافہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے یہ بات اس سلسلہ میں خاص کر قابل غور ہے کہ ہولی، دیوالی، عید اور شب برات وغیرہ کے بیان میں نظیر نے ان تیوہاروں کے مذہبی رُخ سے زیادہ اُنکے مادّی رُخ کو اُجاگر کر کے امیر و غریب، عوام و خواص پر اُن کے اثر اور ردّ عمل کا ذکر کیا ہے۔

اِس سلسلہ میں جب ہم کسی قدر گہری نظر ڈالتے ہیں تو نظیر کے یہاں ایک طرح کا تخیلی تضاد نظر آنے لگتا ہے جسے انکی طویل زندگی کے مختلف ادوار اور تحلیل نفسی کی مدد سے حل تو کیا جا سکتا ہے لیکن بہ ظاہر کوئی بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک طرف تو نظیر نے دنیا سے لذت اندوز ہونے پر زور دیا ہے، عیش و مسرت پر اُکسا کر اس دنیا کو رنگین بنانے کی دعوت دی ہے، زندگی کے لطف اور جوانی کی سرمستیوں کی طرف اشارہ کر کے رنگ رلیوں میں حصّہ لینے کی جانب مائل کیا ہے اور دوسری طرف موت، خدا، نیکی، بدی، فنا اور عقبیٰ سے ڈرا کر عیش و مسرت کی تخیلی لذت بھی ہم سے چھین لی ہے، ایک طرف وہ یہ صدا بلند کرتے ہیں ؎

دیکھ ٹک غافل چمن کو گلفشانی پھر کہاں!

تو دوسری طرف دنیا پرستی کے خلاف وعظ کے ذریعہ سے ترک دنیا پر آمادہ کر دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہر چیز کا انجام فنا ہے اُس وقت

ہمارے کانوں میں ؎

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے

جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور جوانی کو جوانی کی طرح، زندگی کو زندگی
ی طرح بسر کرنے کا جو حوصلہ ہمارے اندر پیدا ہوا تھا وہ ہم میں باقی نہیں رہتا
ہ ایک نظم میں جنت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں تو دوسری نظم میں اس دنیا
ی بے ثباتی بیان کر کے ہمارے دماغ میں کشمکش پیدا کر دیتے ہیں۔ شاید
س کی ایک وجہ یہ ہو کہ اُن کی عمر کے مختلف دور تھے، جوانی اور جوانی
ے گرد و پیش کا زمانہ رندی اور لاابالی پن میں بسر ہوا لیکن آخر عمر میں
یت اور عقبیٰ کے تخیل نے کمزور پا کر غلبہ حاصل کر لیا جوانی میں یہی دنیا
نت تھی، آنے والی زندگی کا خیال نہ ستاتا تھا۔ زندگی ہر روپ اور
ر رنگ میں رواں، دواں، جواں اور سبک خرام تھی۔ غم تھا تو معشوق
ا اور تکلیف تھی تو ہجر کی۔ مگر بڑھاپے نے کمزور کر دیا، اب جوانوں کو
ساتھ رنگ رلیوں میں شریک ہونے کی طاقت نہ تھی۔ آنے والی دنیا
ی تیاری کا خیال پیدا ہوا، اپنی موت کے ساتھ ساری دنیا کے فانی ہونے
ا خیال آنے لگا اور یہی دنیا جس نے جوانی کو جوانی بنایا تھا، نغمہ اور
نگ میں شرابور کر دیا تھا مایا کا جال معلوم ہونے لگی۔ خیر یہ بحث مقررہ

موضوع سے خارج ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک مفکر اور فلسفی اپنی بات کی پچ کرتا ہے اور اپنے خیال پر ایک ضدی کی طرح قائم رہنا چاہتا ہے لیکن ایک عام آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔ اُس کی زندگی کے لمحات کسی ایسے نظام کے پابند نہیں بن سکتے جس میں ہر بات معین اور جچی تُلی ہو۔ نظیر نہ تو مفکر تھے اور نہ فلسفی۔ یہ اُردو شاعری کی خوش نصیبی ہے اور ہمارے لئے یہی بہت ہے کہ ہم انھیں عام انسانوں کی طرح، عام انسانوں کے جذبات اور تجربات کا ترجمان پاتے ہیں۔ فلسفی اور مفکر نظیر کو پا کر ہم اُس نظیر کو کھو دیتے جو عوام میں گھُل مِل کر اُن کے متعلق کچھ لکھ سکا۔

نظیر کی شاعری میں انسان ایک زندہ، متحرک، حسّاس اور مادّی اسباب سے مسرور و دلگیر ہو جانے والی مخلوق کی شکل میں آتا ہے۔ "آدمی نامہ" میں اُنھوں نے مفلس عوام کے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی ہے جہاں ہر شخص آدمی ہونے کی حیثیت سے ایک ہی کشتی کا سوار نظر آتا ہے انسان کی عظمت کے سامنے طبقات کے تفوق اور پستی کا سر جھکتا ہے ہر شخص جو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہوا ہے وہ "آدمی" ہے اور اسی احساس کی تفسیر نظیر کے بہت سے خیالات میں ہوتی ہے مجموعی حیثیت سے "آدمی نامہ" میں نظیر نے اپنے خالص بیانیہ انداز میں طرح طرح سے یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ "اشراف اور کمینہ سے

لے شاہ تا وزیر"۔ ہر شخص "آدمی" ہے یہ خیال عوام کے دلوں میں نہ جانے کون سی آگ بھڑکا سکتا تھا لیکن وہ زمانہ طبقاتی اور سیاسی شعور کا نہ تھا تقدیر پرستی نے ان باتوں کے سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا تھا۔ نظیر نے اس خیال سے عوام کے دماغ کو بسانا چاہا تھا کہ اُن میں بھی خود شناسی کی پیاس پیدا ہو۔ رمّال اور نجومی آج بھی جاہل اور ناسمجھ لوگوں کو دھمکا کر، بہلا کر اور دوسرے طریقوں سے اپنے فریب میں پھنسا لیتے ہیں، اُس وقت تو یہ ایک عام بات تھی اور بیچارے عوام آسانی سے اُن کا شکار ہو جاتے تھے۔ نظیر نے اُن جھوٹے خداؤں کا راز فاش کرنا چاہا تھا تاکہ عوام اُن سے بچ سکیں ؎

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنے ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس، کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل، کوئی ہے فاضل، کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروروں پنڈت ہزار سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(رمّال اور نجومی کے بیان میں)

نظیر نے رمّال اور نجومی کا مذاق اُڑا کر نہیں بلکہ نرم، دلکش اور

پر اثر ترغیب کی مدد سے لوگوں کا دل اُدھر سے پھیرنا چاہا تھا۔ پودنے اور گڑھ پنکھ کی لڑائی" سے اگر مجازات کو علیحدہ کر کے دیکھیں تو ہم نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ کمزور بھی شہزور پر فتح پا سکتے ہیں عوام کی ہمدردی کا بہترین ذریعہ نظیر کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ اُن کے بہت سے بے بنیاد توہمات کو اُن کے دل سے نکال کر اُنھیں بتا دیں کہ آدمی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی سب کے برابر ہیں اور جذبات و احساسات میں خواص سے مشابہت رکھتے ہیں۔

جن موضوعات کی جانب آج بھی شعراء پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکے انھیں نظیر نے بہت پہلے اپنا بنا لیا تھا۔ "ککڑی" اور "تل کے لڈو"۔ "کورے برتن کی تعریف" اور "کوڑی"، "مفلسی"۔ "آٹے دال کا بیان" "پیسہ" اور ایسے ہی نہ جانے کتنے موضوعات کا انتخاب اُن کے صحیح رجحان کا پتہ دیتا ہے اور یہ رجحان رابطۂ عوام کے بغیر بن نہیں سکتا تھا۔ ککڑی اور تل کے لڈو کورے برتن کی تعریف ایسی نظمیں معلوم ہوتی ہیں جنھیں غالباً نظیر نے بازار کے پیشہ وروں کی فرمائش پر لکھا ہوگا اسی لئے اُن میں علاوہ اس کے کہ وہ ان موضوعات پر سو سال پہلے کی نظمیں ہیں اور کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جو انھیں عوام سے پوری طرح متعلق کر سکے۔ شاعرانہ ترغیب کی وجہ سے "کورے برتن کی تعریف"

ضرور تھوڑی دیر کے لئے ہماری نگاہوں میں قیمتی برتنوں کو سبک کر دیتی ہے اور غالب کا "جام سفال" یاد آنے لگتا ہے۔

لیکن اسی طرح کی دوسری نظموں کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جاسکتی موضوعات پر ایک نظر ڈالئے "آٹے دال کا بیان"۔ "مفلسی"۔ "پیسہ" "چپاتیاں"۔ "روٹی کی تعریف" اور ایسی متعدد نظموں سے ہمارے دماغ پر عجیب وغریب اثر پڑتا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نظام معاشرت میں ان چیزوں کا بیان صرف اخلاق اور خدا ترسی کے تصوّر پر مبنی تھا اور نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ایسے تمدّن سے اختلاف کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی تھی اور نہ آج ہی ہمارے شعرا، پوری طرح اس صحیح سیاسی اور معاشرتی قوت سے کام لیتے ہیں لیکن نظیر نے عام انسانوں کی صحبت میں رہ کر ایک حساس شاعر کی طرح انکی زندگی کے تصادمات کو محسوس کیا تھا، وہ اپنے "شہر آشوب" میں عام لوگوں کی بیکاری اور مفلسی کا رونا روتے ہیں اگرچہ اس میں نہ تو سودا کے اندازِ بیان کی تلخی اور تیزی ہے اور نہ تمدن پر اتنی سخت تنقید، لیکن اُس بے اطمینانی کا اظہار ضرور ہے جو مغلیہ حکومت کے زوال کے زمانہ میں اچھی طرح پیدا ہوچکی تھی اور جس کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ قومی تھی۔ نظیر نے کئی نظموں میں قناعت کا زہر آمیز مفہوم پیش کرنے کے بعد بھی افراد

کی ضروریات کو خالص مادّی نقطۂ نظر سے دیکھا اور جانچا ہے۔ سماج کے نظام کی بدولت کوئی کچھ بن جائے لیکن زندگی کا بنیادی سوال بھوک ہے نظیر نے اسے محسوس کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ پڑھنے والوں کو بھی ان پر غور کرنے کے لئے مجبور کیا ہے بعض اقتباسات طولانی بحث سے زیادہ اہم ہیں ؎

گر نہ آٹے دال کا اندیشہ ہوتا سدِّ راہ
تو نہ پھرتے ملک گیری کو وزیر و بادشاہ
ساتھ آٹے دال کے ہے حشمت و فوج و سپاہ
جا بجا گڑھ کوٹ سے لڑتے ہوئے پھرتے ہیں آہ
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں
منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خاں
جاگتے دربار میں کیوں آدھی آدھی رات ہاں
کیا عجب نقشہ پڑا ہے آہ کیا کہئے میاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

اپنے عالم میں یہ آٹا دال بھی کیا فرد ہے
حُسن کی آن و ادا سب اس کے آگے گرد ہے

عاشقوں کا بھی اسی کے عشق سے مُنھ زرد ہے
تا کجا کہئے کہ کیا وہ مرد کیا نامرد ہے
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا
(آٹے دال کے بیان میں)

ان حقیقتوں سے انکار کر کے کون نافہموں کی صف میں جانا چاہے گا؟ پھر روٹیوں کی تعریف شروع ہوئی ہے۔ اس کی مادیت حقیقتاً اتنی ٹھوس ہے کہ "کامل فقیر" "خالق" اور "نور" کے ذکر کے بعد بھی ہمارا ذہن بھوک اور روٹی کے بنیادی سوال سے نہیں ہٹتا بلکہ اور قوی ہو جاتا ہے ؎

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اُسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آگ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں
پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے

ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں
پھر پوچھا اُس نے "کہئے یہ ہے دل کا نور کیا؟
اُس کے مشاہدہ میں ہے کھلتا ظہور کیا؟"
وہ بولا سُن کے "تیرا گیا ہے شعور کیا؟
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا؟
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں"
اور پھر یہی نہیں بلکہ "اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں"

(روٹیوں کی تعریف میں)

اس کے بعد کسی مزید تنقید کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور نظیر کی شخصیت کا وہ پہلو اُبھر کر ہمارے سامنے اچھی طرح روشن ہو جاتا ہے جس میں انھوں نے عوام کے مسائل کو عوام ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا دل برابر سوال و جواب کرتا رہا۔ انھوں نے اپنی طویل عمر میں اپنے دور کے نظامِ تمدن کے بہت سے کرشمے دیکھے اور سب کا خاتمہ مادّی مجبوریوں پر نظر آیا۔ آج یہ سوال ملک میں برابر اُٹھ رہا ہے کہ ایک حسین اور شریف دوشیزہ عصمت فروشی کی زندگی کیوں مجبور ہوتی ہے؟ ایک نیچے طبقے کا غریب آدمی چوری کی طرف کیوں

مائل ہوتا ہے؟ ایک مفلوک الحال بچہ "بھیک مانگنا کیوں شروع کرتا ہے؟ اور جواب کے لئے تجزیۂ نفس سے لیکر مذہب اور اقتصادیات تک بات جاتی ہے۔ تھوڑے سے لوگ جنھوں نے انسانی تمدّن کی تاریخ کو انسانی ضروریات اور کشمکش حیات کی صحیح روشنی میں پڑھا ہے وہ تو کوئی حکمی جواب دیتے ہیں لیکن دوسرے لوگ خدا کی مصلحت اور تقدیر کہہ کر ان سوالات کو ٹال دینا چاہتے ہیں۔ نظیر نے اس کا وہی جواب دیا ہے جو دنیا کے بہترین ماہرینِ معاشیات دے سکتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نظیر موجودہ عہد کے کوئی ڈگری یافتہ ڈاکٹر تھے، مقصد صرف اتنا ہے کہ انھوں نے اپنے وسیع تجربات کی مدد سے اور عوام کی زندگی کے ہر پہلو کا قریب سے مطالعہ کر کے وہی نتائج نکالے جو حکیمانہ اور عالمانہ تجزیۂ اسباب کے بعد نکالے جاتے ہیں۔ انکی نظم "مفلسی" کے بعض حصّے ملاخطہ کیجیئے ؎

مفلس میں ہو ویں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر

ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اس کی چاہ
جس طرح کُتّے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی
جب خوبرو پہ آن کے پڑتا ہے دن سیاہ
پھرتا ہے بوسے دیتا ہے ہر اک کو خواہ مخواہ
ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اس کی چاہ
گر حسن ہو ہزار روپے کا تو اس کو آہ لُو
کیا کوڑیوں کے مول بکاتی ہے مفلسی
چوری پہ لاکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخوندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

یا :- کوڑی ہے جس کے پاس وہ اہلِ یقین ہے

کیا ان اشعار میں مفلسی کے نتائج اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتے کہ اکثر اخلاقی برائیوں اور پستیوں کے دور کرنے کا تنہا علاج یہی ہے کہ دولت کی تقسیم صحیح ہو؟ نظیر نے یہاں تک نہ سوچا ہو لیکن شاعر غیر شعوری طور پر بھی سماج کی کشمکش اور تضادات سے متاثر ہوتا رہتا ہے، ان موضوعات پر میر اپنی سریع الاحساس طبیعت، سودا اپنی ہمہ گیری، مصحفی اپنی پُر گوئی، انشاء اپنی ذہانت اور میر حسن اپنی قوتِ

بیان کے باوجود نہ لکھ سکتے تھے کیوں کہ وہ پستی یا بلندی جہاں سے کھڑے ہوکر یہ چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں انھیں نصیب نہ تھی۔ نظیر کو اس کا موقعہ پوری طرح ملا۔ اِس لئے وہ فرضی تخیلات سے آگے بڑھ سکے۔ اندھیری رات کے ساتھ ہندوستانی شعراء کے مہجور اور بیکس نالوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن نظیر کے لئے اندھیری رات ایک ایسے رومانی وصل کا سامان مہیّا کرتی ہے جسے عملی طور پر عشق کرنے والے ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آندھی سے لوگ کتنا ہی منغّص ہوں لیکن نظیر نے اُسی کو اپنے ارمانوں کی تکمیل کے لئے مفید پایا۔ عشق و محبت کی یہ عملی تشریح جس میں تخئیل محض کی بھیانک بلند پروازیاں ڈھونڈھے نہیں ملتیں، موسموں اور تیوہاروں کا بیان مفلسی اور اُس کے لوازم کا انسانی عقاید اور جذبات سے تعلق، کرشن جی، حضرت علی، سلیم چشتی اور نانک ہر ایک سے عقیدت کا اظہار، انھیں چیزوں میں ہمیں اُردو شاعری کے وہ اجزاء ملتے ہیں جو صرف تخئیل کے بھروسہ اور کتابی معلومات کی مدد سے پیش نہیں کئے گئے بلکہ حقیقتاً عوام الناس کی روزمرہ کی زندگی، اُس کی کشمکش، اُس کے تضاد اور اُس کے تجربات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں۔ اُنکی شاعری میں نظامِ تمدن کے بدلنے کی ایک دبی اور سہمی ہوئی خواہش کہیں کہیں سے جھانکتی ہوئی ضرور دکھائی دیتی ہے لیکن شاعری کی روح انقلابی نہیں ہے اور

شاید اُس وقت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

نظیر کی شاعری کو اگلے تذکرہ نویسوں نے کوئی اہمیت نہیں دی اس پر نہ تو تعجب ہونا چاہیئے اور نہ برہمی، کیونکہ جس ذوقِ سلیم کی مدد سے وہ لوگ کسی کی شاعری میں حُسن یا عیب تلاش کرتے تھے، وہ ذوقِ سلیم خود درباری اثرات سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا پَروردہ تھا۔ وہاں حقیقت پر خیال آرائی کو اور معنی پر صورت کو تفوق حاصِل تھا۔ وہاں زیادہ کوشش انداز بیان میں صنایع کے استعمال پر صرف ہوتی تھی اور وہی پسند کی جاتی تھی نظیر کو سمجھنے والے نقاد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ مواد کو اہمیت دے اور انداز بیان کو اُسی مواد کے اظہار کی روشنی میں دیکھے، اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو یقیناً اُسے نظیر کے یہاں کچھ نہ ملے گا کیونکہ نظیر کے یہاں اسلوب کو مواد سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اُس کے مفہوم کو واضح کر سکے نظیر ہر چیز کا ذکر مفصل کرتے ہیں، اُن کے خزانہ میں لفظوں کی کمی نہیں ہے۔ بہت سے لفظ جو لکھنؤ اور دلّی کی ٹکسال میں کھوٹے سکّوں کی حیثیت رکھتے ہیں نظیر کے یہاں کھرے ہیں کیونکہ وہی لفظ اُن کا مطلب ادا کرتے ہیں اگر وہ اُن لفظوں کو ترک کر دیں تو اُن لوگوں سے دور ہو جائیں جن کے لئے وہ شاعری کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سمجھنے کے لئے انداز بیان میں جتنی وسعت پیدا کی جا سکتی ہے نظیر اُن سے کام

لیتے ہیں بعض اوقات تو وہ کوئی خوبی جان بوجھ کر نہیں پیدا کرنا چاہتے لیکن اُن کا خلوص اُس خوبی کو روشن کر دیتا ہے، وہ شعوری طور پر طنز کا استعمال نہیں کرتے لیکن کھلی کھلی حقیقتوں کا صاف صاف بیان خود ایک طنز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

نظیر کی رومانی اور عشقیہ شاعری میں بہت سے لوگوں کو عریانی نظر آتی ہے۔ یقیناً اس میں تھوڑی سی صداقت ہے لیکن اگر ذرا غور و فکر کو کام میں لائیں تو نظیر پر یہ الزام کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتا۔ اُن کے یہاں جنسی اور ذہنی رُکاوٹیں نہیں ہیں، وہ ان مسائل کو بھی زندگی کے خاص مسائل میں شمار کرتے ہیں اور ان کے متعلق بھی عوام سے صاف لفظوں میں باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ یہی چیز اُن کی خصوصیت بن جاتی ہے کیونکہ ہم اُن کے تجربات میں ایسی معصومانہ صداقت اور بیان میں ایسی سچائی پاتے ہیں جس نے اُردو شاعری میں نئی راہیں اور نئے گوشے پیدا کئے۔

بہرحال نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے جب ہم عوام کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُس کا مقصد اشتراکی تصورات سے بننے والے عوام آزادی، جمہوریت اور ترقی کا تصور رکھنے والے عوام سے نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کا وہ عام طبقہ مراد ہوتا ہے جسے جاگیرداری نظام کے زمانہ میں

زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی لیکن جس کی زندگی میں بھی شاعر کا مشاہدہ شاعری کے لئے مواد تلاش کر سکتا ہے۔ اِس لئے نظیر کو نہ تو دورِ جدید کا علمبردار کہہ سکتے ہیں اور نہ پرولتاری شاعر، بلکہ انھیں دربار کی گھٹی ہوئی فضا سے دور رہ کر تازہ ہوا میں سانس لینے والا اور بندھے ٹکے موضوعات کی زنجیریں توڑ کر زندگی کی وسیع ترین فضا میں پرواز کرنے والا شاعر کہا جا سکتا ہے جس نے صرف خواص پر نہیں بلکہ انسان پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی۔

سنہ ۱۹۳۹ء